چراغ حسن حسرتؔ

(حالاتِ زندگی)

چراغ حسن نام اور حسرتؔ تخلص تھا۔ ۱۹۰۲ء میں کشمیر کے گاؤں بارہ مولا میں پیدا ہوئے۔ آباؤ اجداد ہندو تھے۔ آپ کے والد نے اسلام قبول کیا۔ اُردو اور فارسی کی تعلیم والد سے حاصل کی۔ مگر باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہ ملا اور پرائیویٹ طور پر پڑھتے رہے۔ شعروادب کا شوق اُنہیں بچپن ہی سے تھا۔ اپنی عملی زندگی کا آغاز مدرسہ سے کیا۔ مگر جلد ہی ملازمت چھوڑ کر کلکتہ پہنچے۔ اور ''عصرِ جدید'' اخبار میں ملازم ہوگئے۔ مگر جلد ہی ترقی کرکے ایڈیٹر بن گئے۔ ''آفتاب'' کے نام سے اپنا ادبی پرچہ نکالا۔ جب کہ مالی مشکلات کے باعث بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد ''نئی دنیا''۔ ''زمیندار'' ''پھول'' اور ''تہذیبِ نسواں'' کی ادارت میں شامل رہے۔

دوسری جنگ عظیم میں فوج میں شامل ہوئے۔ اور میجر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پہلے اخبار ''امروز'' سے منسلک رہے اور بعد میں کچھ عرصے کے لیے ریڈیو پاکستان میں کام کیا۔ آخری عمر میں سفارت خانوں میں مترجم کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

حسرتؔ بنیادی طور پر ایک بلند پایہ صحافی اور انشا پرداز ہیں۔ انہوں نے اپنی محنت اور لگن سے اُردو صحافت کو بے حد فروغ دیا۔ اُن کی زبان سادہ، شستہ اور عام بول چال کی زبان ہے۔ انہیں مشکل الفاظ تکلف و تصنع اور آورد سے سخت نفرت ہے۔ وہ ہر بات کو کمالِ بے ساختگی سے کہنے کے عادی ہیں۔ ان کی تحریریں شگفتگی، اعتدال اور توازن کی عمدہ مثال ہیں۔

خاکہ نگاری میں اِنہیں کمال حاصل ہے۔ خاکہ نگاری میں ان کا فن نکھر آتا ہے اور وہ اپنے کردار کے مختلف حالات اور متضاد پہلو بیان کرکے اُس کی شخصیت کو اِس طرح اُجاگر کرتے ہیں؛ کہ ان کی عظمت کا ہمارے ذہنوں پر نقش ہوجاتی ہے۔

حسرت کا اصل میدان مزاح نگاری ہے۔ اور اُن کی مزاح نگاری، شخصیتوں کے خاکے، شگفتہ بیان اور ہلکی سی ادبی چاشنی سے جنم لیتی ہے۔ انہوں نے مولانا ظفرعلی خان اور آغا حشر کے خاکوں میں جو رنگ بھرا ہے وہ قابلِ تعریف ہے۔ تحریف کے ذریعے مزاح پیدا کرنا بھی حسرت کی اہم خصوصیت ہے۔ حسرت نے نظم و نثر دونوں میں تحریف نگاری کی شان دار مثالیں پیش کیں۔ ۱۹۵۵ء میں لاہور میں وفات پائی۔

آغا حشر

(چراغ حسن حسرت)

مقاصدِ تدریس

۱۔ اُردو ڈراما نگاری میں آغا حشر کاشمیری کے مقام سے آگاہ کرنا۔
۲۔ چراغ حسن حسرت کے اُسلوبِ نثر سے واقفیت دلانا۔
۳۔ طلبہ کو رموزِ اوقاف کے درست استعمال سے روشناس کرانا۔
۴۔ طلبہ سے کسی بھی تخلیقی سبق کی مشق کرانا۔

خاص الفاظ وتراکیب: کلے ٹھلے ۔ دیدارُو ۔ سہم جانا ۔ وارد ہونا ۔ ہینگ ۔ قدرشناس ۔ خوام۔ گیسو ایکٹر ۔ موجِ زمزم۔

مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے پہلی مرتبہ آغا حشر کا نام کب سنا؟ صرف اتنا یاد ہے کہ ''ڈراما'' کا نام سننے سے پہلے اس نام سے میرے کان آشنا ہو چکے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد میری معلومات میں اتنا اضافہ اور ہوا کہ آغا حشر جو کچھ کہتا ہے اس کا نام ڈراما ہے۔ ڈراما کی اصل حقیقت کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہاں کبھی کبھی یہ خیال آتا تھا کہ ڈراما اور ڈرانا کے معنی میں بہت تھوڑا فرق ہوگا۔

ہمارے پڑوس میں ایک افغان سردار رہتے تھے۔ ان کا ایک نوکر تھا جسے سب ''آغا آغا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ بڑے کلے ٹھلے کا دیدارو جوان تھا۔ سیاہ گنجان داڑھی۔ زلفیں چھٹی ہوئیں وہ جدھر سے گزرتا تھا۔ لڑکے ''آغا آغا'' کہہ کر اس کے پیچھے دوڑ پڑتے تھے۔ وہ اکثر اوقات تو ہنستا ہوا گزر جاتا لیکن کبھی کبھی لڑکوں کے نعرے سن کے چلتے چلتے رک جاتا۔ اپنی زبان میں چلا چلا کے کچھ کہتا اور سرخ سرخ آنکھیں نکال کر ہماری طرف اس طرح دیکھتا کہ سب سہم جاتے۔

انہیں دنوں ہمارے قصبے میں ایک اور آغا وارد ہوئے۔ یہ ہینگ بیچنے آئے تھے۔ لمبی داڑھی، بال شانوں پر بکھرے ہوئے، صدری پر میل کی تہہ جمی ہوئی تھی۔ وہ ایک ہاتھ سے گٹھڑی سنبھالے سڑک پر کھڑے رہتے اور ''اینگ لے لو۔ اینگ لے لو'' پکارا کرتے تھے لیکن میں نے کبھی کسی شخص کو ان سے ہینگ خریدتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی وہ جھنجھلا کے چلا چلا کر کچھ کہتے۔ غالباً بستی کے لوگوں کو جن میں کوئی ہینگ کا قدر شناس نہیں تھا۔ گالیاں دیتے ہوں گے۔ اس عالم میں کوئی شخص آنکلتا تو اسے پکار کر کہتے ''خو! اینگ لے لو'' اگر وہ چپ چاپ گزر جاتا تو کچھ دیر تک جھک کر خاموش ہو رہتے ورنہ اگر جواب میں کہتا کہ مجھے ہینگ کی ضرورت نہیں تو چلا کے فرماتے ''خوام تمھارے باپ کا نوکر ہے کہ تمھارا واسطے اتنی دور سے اینگ لایا۔ اینگ لے لو۔ ام

سے مسخری مت کرو"۔

غرض آغا، حشر اور ڈراما تینوں لفظ میرے نزدیک بہت ڈراؤنے اور بھیانک تھے اور انہوں نے میرے ذہن پر کوئی خوشگوار اثر نہیں چھوڑا۔

پھر جب ہمارے ہاں ایک "ڈرامیٹک کلب" کی بنیاد پڑی اور "اسیرِ حرص" "سفید خون" "خوابِ ہستی" "ہملٹ" کے نام ہر شخص کی زبان سے سنائی دینے لگے تو آغا حشر کا نام بھی بار بار زبانوں پر آنے لگا۔ اس دورافتادہ مقام میں لے دے کے یہی ایک تفریح تھی اس لیے بوڑھے، بچے، جوان سب تھیٹر دیکھنے جاتے تھے۔ مستری خدابخش سے جو تھیٹر کے پردے بھی بناتے تھے اور میلوں میں اپنا ہنڈولا لے کر بھی پہنچ جاتے تھے، سہیلیوں تک جن میں اکثر سکول کے بھاگے ہوئے لڑکے تھے، میں سب کو جانتا تھا لیکن اُن میں آغا حشر کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ آغا حشر پردوں کے پیچھے کھڑا ہے۔ اس کا سر چھت سے لگا ہوا ہے۔ لمبی داڑھی ہے۔ لمبے بال کمر تک پہنچتے ہیں۔ ایک ہاتھ میں ہینگ کی گٹھڑی ہے۔ دوسرے میں جادو کا ڈنڈا۔ اسی کے حکم سے پردے اٹھتے اور گرتے اور ایکٹر بھیس بدل بدل کر نکلتے ہیں۔ ایک آدھ مرتبہ خیال آیا کہ کسی طرح پردے کے پیچھے جا کر اس کی ایک جھلک دیکھ لوں لیکن پھر ہمت نہ پڑی۔

پنجاب میں اگرچہ تھیٹر، نے چنداں ترقی نہیں کی اور یہاں منشی غلام علی دیوانہ اور ماسٹر رحمت کے کینڈے کے لوگ اس فن میں سند الوقت سمجھے جاتے تھے لیکن ۱۹۲۱ء میں جب مجھے پہلی مرتبہ لاہور آنے کا اتفاق ہوا تو یہاں آغا حشر کی شاعری کی دھوم تھی۔ جن لوگوں نے انہیں انجمن حمایت اسلام میں نظمیں پڑھتے دیکھا تھا وہ ان کے انجمن کے جلسے میں آتے اور نظم سنانے کی کیفیت اس ذوق شوق سے بیان کرتے تھے گویا کربلائے معلیٰ کے محرم کا حال بیان کر رہے ہیں۔ "موجِ زمزم" اور "شکریہ یورپ" کے اکثر اشعار لوگوں کو زبانی یاد تھے اور انہیں آغا کی طرح مٹھیاں بھینچ کر گونجیلی آواز میں پڑھنے کی کوشش بھی کرتے تھے

اگرچہ آغا اپنے عروجِ شباب کے زمانے میں صرف ایک مرتبہ پنجاب آئے لیکن ان کا یہ آنا عوام وخواص دونوں کے حق میں قیامت تھا۔ یعنی جو ثقہ حضرات ڈراما کو بدوضع اور آوارہ لوگوں سے مخصوص سمجھتے تھے ان کی رائے اس فن کے متعلق بدل گئی اور کیوں نہ بدلتی؟ اسی گروہ کے ایک شخص نے انجمنِ حمایتِ اسلام کے جلسہ میں، جو اُن دنوں ایک قومی میلہ سمجھا جاتا تھا، ایسی نظم پڑھی کہ روپے پیسے کا مینہ برس گیا۔ اور جو کام بڑے بڑے عالموں سے نہ ہوسکا اس نے کر دکھایا۔

میں ۱۹۲۵ء میں کلکتہ گیا تو آغا صاحب کلکتہ چھوڑ کر مہاراجہ ٹکاری کے ہاں جاچکے تھے۔ لیکن ان کے ہزاروں مداح ان کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے کلکتہ میں موجود تھے۔ ان کی زبانی آغا کی زندگی کے اکثر واقعات ان کے لطیفے، اشعار، پھبتیاں سنیں۔ کوئی سال بھر کے بعد ایک دن کسی نے آکر کہا کہ آغا آئے ہیں۔ فائن آرٹ پریس والے لالہ برج لال اروڑا آغا کے بڑے

عقیدت مند تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ''آغا آگئے۔ ان سے کب ملوائیے گا''؟ وہ کہنے لگے۔ ابھی چلو نیکی اور پوچھ پوچھ۔ میں نے رسالہ ''آفتاب'' کے کچھ پرچے بغل میں دبائے۔ لالہ برج لال نے ٹوپی ٹیڑھی کر کے سر پر رکھی اور بخطِ مستقیم آغا کے ہاں جا پہنچے۔ وہ ان دنوں سکی سٹریٹ میں رہتے تھے۔ بڑا وسیع مکان تھا۔ ڈیوڑھی سے داخل ہوتے ہی صحن تھا۔ اس کے دہنے بائیں کمرے۔ لالہ برج لال نے ان کے نوکر سے پوچھا ''آغا صاحب کہاں ہیں''؟ اُس نے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ صحن سے ملا ہوا ایک وسیع کمرہ تھا۔ اس میں ایک چارپائی پر آغا صاحب صرف لنگی باندھے اور ایک کرتا پہنے لیٹے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی اٹھ بیٹھے۔ اب جو دیکھتا ہوں تو ہینگ والے آغا اور اس آغا میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سر پر انگریزی فیشن کے بال، داڑھی منڈی ہوئی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، دُہرا جسم، سرخ و سفید رنگ، درمیانہ قد، ایک آنکھ میں نقص تھا، محفل میں بیٹھے ہوئے ہر شخص یہ سمجھتا تھا کہ میری طرف ہی دیکھ رہے ہیں۔ بڑے تپاک سے ملے۔ پہلے لالہ برج لال سے خیر و عافیت پوچھی۔ پھر میری طرف متوجہ ہوئے اور ادبی ذکر واذکار چھڑ گئے۔

آغا صاحب نے اگرچہ ہزاروں کمائے اور لاکھوں اُڑائے لیکن ان کی معاشرت ہمیشہ سیدھی سادی رہی۔ مکان میں نہ نفیس قالین تھے نہ صوفے نہ کوچ، نہ ریشمی پردے نہ غالیچے۔ نفیس کپڑے پہننے کا بھی شوق نہ تھا۔ گھر میں ہیں تو لنگی باندھے ایک بنیان پہنے، کھری چارپائی پر بیٹھے ہیں۔ باہر نکلے ہیں تو ریشمی لنگی اور لمبا کرتا پہن لیا۔ میں نے پہلی مرتبہ انہیں اسی وضع میں دیکھا اور زندگی کے آخری ایام میں جب لاہور آئے ان کی یہی وضع تھی۔ ہاں اکثر لوگوں سے اتنا سنا ہے کہ لاہور آنے سے پہلے وہ کلکتہ میں بڑے ٹھاٹھ سے رہتے تھے۔

آغا بڑے حاضر جواب اور خوش طبع شخص تھے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے سب پر چھا جاتے تھے۔ ان کے ملنے والوں میں اکثر لوگ ضلع جگت میں طاق اور پھبتی میں مشاق تھے۔ اور جب شام کو صحبت گرم ہوتی، تین تین چار چار آدمی مل کے آغا پر پھبتیوں کا جھاڑ باندھ دیا کرتے تھے لیکن آغا چوکھی لڑنا جانتے تھے۔ حریف دم بھر میں ہتھیار ڈال دیتا لیکن آغا کی زبان نہ رکتی تھی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بانکا پھکیت سروہی کے ہاتھ پھینکتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی کمر کو بتا کے سر پر وار کیا۔ کبھی پالٹ کا ہاتھ مارا۔ کبھی دہنے سے کبھی بائیں سے۔ اِس فن میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔

وہ ہر قسم کی کتابیں پڑھتے تھے۔ ادنیٰ قسم کے بازاری ناولوں اخباروں رسالوں سے لے کر فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کی اعلیٰ تصانیف تک سب پر ان کی نظر تھی۔ اور فضل بک ڈپو سے دارالمصنفین تک وہ سارے اداروں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ کلکتہ میں ان کا معمول یہ تھا کہ سہ پہر کو گھر سے نکلے اور بخط مستقیم اخبار ''عصر جدید'' کے دفتر میں پہنچے۔ پہلے سارے اخبار پڑھے۔ پھر رسالوں کی نوبت آئی۔ کبھی ریویو کے لیے کوئی کتاب آ گئی، تو وہ بھی آغا صاحب کی نذر ہوئی۔ کچھ اخبار اور رسالے تو وہیں بیٹھے

بیٹھے دیکھ لیے، جو بچ رہے، انہیں گھر لے گئے۔ بازار میں چلتے چلتے کتابوں کی دکان نظر آ گئی۔ کھڑے ہو گئے۔ اچھی اچھی کتابیں چھانٹ کے بغل میں دبائیں اور چل کھڑے ہوئے۔ راستے میں کسی کتاب کا کوئی گرا پڑا ورق دکھائی دیا تو اسے اٹھا لیا اور وہیں کھڑے کھڑے پڑھ ڈالا۔ نوکر بازار سے سودا سلف لے کر آیا ہے۔ بنیے نے اخباروں اور کتابوں کے اوراق میں پڑیاں باندھ کے دی ہیں۔ یکا یک آغا صاحب کی نظر پڑ گئی۔ نوکر سے پوچھ رہے ہیں۔ اس پڑیا میں کیا ہے؟ شکر! اچھا شکر ڈبے میں ڈالو۔ پڑیا خالی کر کے لاؤ۔ اسے کہیں پھینک نہ دیجیو۔ یہ بڑے کام کی چیز معلوم ہوتی ہے۔ خدا جانے کسی اخبار کے ورق ہیں یا کتاب کے۔ بہر حال مجھے ان پر شبلی کا نام لکھا نظر آیا ہے۔

مطالعے سے ان کے اس شغف کا حال سن کر شاید بعض لوگوں کا خیال ہو کہ آغا نے بہت بڑا کتب خانہ جمع کر لیا ہوگا لیکن واقعہ یہ ہے کہ کتب خانہ چھوڑ ان کے ہاں دس پانچ کتابیں بھی نہیں تھیں۔ ایک تو ان کا حافظہ بہت اچھا تھا۔ ایک مرتبہ کوئی کتاب پڑھ لیتے تھے تو اسے دوسری مرتبہ دیکھنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ دوسرے ان کی طبیعت علائق سے گھبراتی تھی۔ کتابیں سینت سنبھال کے رکھنے کے جھنجھٹ میں کون پڑے۔ ان کا تو بس یہ حال تھا کہ کتاب آئی۔ پڑھ کے مکان کے کسی گوشے میں ڈال دی کوئی ملنے والا آیا اور اٹھا کے لے گیا۔

یہ اسی مطالعے کی برکت تھی کہ ان کی معلومات پر لوگوں کو حیرت ہوتی تھی۔ طب ہو یا فلسفہ۔ شاعری ہو یا ادب۔ کسی موضوع میں بند نہیں تھے اور جہاں علم ساتھ نہیں دیتا تھا وہاں ان کی ذہانت آڑے آ جاتی تھی۔ بازار سے نئی جوتی منگوائی ہے کسی نے پوچھا آغا صاحب کتنے کو مول لی ہے؟ بس آغا صاحب نے جوتی کے فضائل اور محاسن پر تقریر شروع کر دی۔ چمڑے کی مختلف قسموں، دباغت کے طریقوں، جوتی کی وضع قطع ایک ایک چیز پر اس تفصیل سے بحث کر رہے ہیں گویا کسی نہایت اہم مسئلہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب ان کی تقریر ختم ہوئی تو سننے والوں کو یہ احساس تھا کہ آغا صاحب کی جوتی کو سچ مچ تاریخی حیثیت حاصل ہے۔

آغا مناظرہ کے میدان کے شیر تھے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے تھے۔ سب پر چھا جاتے تھے۔ باقاعدہ تعلیم تو واجبی تھی، لیکن مطالعے نے انہیں کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ ایک دن میں نے کہا آغا صاحب جی چاہتا ہے آپ کے سوانح حیات لکھ ڈالوں۔ کہنے لگے میرے سوانح حیات میں کیا پڑا ہے؟

بزرگوں کا وطن کشمیر ہے۔ وطن میں ان پر کچھ ایسی افتاد پڑی کہ امرتسر اٹھ آئے۔ وہاں سے والد مرحوم شالوں کی تجارت کے سلسلہ میں بنارس پہنچے اور وہیں ڈیرے ڈال دیے۔ ہر چند انہوں نے میری تعلیم میں سعی کی لیکن جی نہ لگا۔ فارسی کی چند کتابیں پڑھ کر چھوڑ دیں۔ وہ پرانی وضع کے آدمی تھے اور مجھے ملائے مکتبی بنانا چاہتے تھے لیکن مجھے ملائیت سے نفرت تھی۔ ابھی

مسیں بھی نہیں بھیگی تھیں کہ بنارس سے بھاگ کر بمبئی پہنچا۔ وہاں پارسیوں نے تھیٹر کا ایسا طلسم باندھ رکھا تھا کہ ادنیٰ و اعلیٰ سب اس پر غش تھے۔ میں نے بھی ڈراما لکھنے کو ذریعہ معاش بنایا اور ایک دو ڈرامے لکھ کر شکسپیئر پر ہاتھ صاف کیا۔ اگرچہ ان دنوں بمبئی میں بڑے بڑے انشا پرداز اور شاعر موجود تھے لیکن خدا کی قدرت کہ تھوڑے دنوں میں سب گرد ہو گئے۔ لو میرے سوانح حیات کا بہت بڑا حصہ تو چند لفظوں میں ختم ہو گیا۔

اکثر لوگوں کو یہ بات بہت ناگوار گزرتی تھی کہ آغا خود اپنی تعریفیں کرتے ہیں اور اپنے سامنے سب کو ہیچ سمجھتے ہیں لیکن آغا صاحب کا خیال تھا کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنی تعریف کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک مرتبہ کسی اخبار میں میری ایک نظم جو غالباً عید کے متعلق تھی شایع ہوئی۔ آغا نے اخبار دیکھا تو نظم کی بڑی تعریف کی۔ خصوصاً آخری شعر کئی مرتبہ پڑھا اور پھر بولے ''اماں؛ تم بہت خوب کہتے ہو۔ اس سے اچھا کوئی کیا کہے گا؟'' میں نے کہا آغا صاحب آپ تو کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں؟ میں کیا اور میری نظم کیا؟ کہنے لگے۔ کیا کہا؟ ہم تعریف کرتے ہیں اور تم اپنی برائی سننا چاہتے ہو۔ اچھا صاحب۔ یوں ہی سہی۔ نظم بہت بری ہے۔ تم نے جھک مارا جو یہ نظم لکھی اور ہم نے جھک مارا جو تمھاری تعریف کی۔ کہو کہو۔ اس ہیچ مدان، پنبہ دان، کج مج زبان، حقیر فقیر سراپا تقصیر کو کیا شعور ہے کہ نظم لکھ سکے۔ حضور کی ذرہ نوازی ہے۔ اور سیدھی سادی زبان میں یہ مضمون ادا کرنا چاہو تو کہو میں نے یہ نظم نہیں لکھی اور تم جھوٹے ہو جو اس کی تعریف کر رہے ہو، ارے بھائی؛ میں تو سمجھتا ہوں کہ اگر تمھارے انکسار کا یہی حال رہا تو فاقے کرو گے۔ سینہ تان کے کیوں نہیں کہتے کہ جی ہاں، میری نظم تعریف کے قابل ہے۔ میں تو یہی کرتا ہوں۔ ''ترکی حور'' لکھ کے رستم جی کو سنایا۔ سب نے واہ واہ کی۔ لیکن سرگوشیاں بھی برابر ہو رہی تھیں۔ حریف اس تاک میں تھے کہ موقع ملے تو ایسی اکھیڑ ماریں کہ آغا چاروں شانے چت جا گرے۔ اتنے میں کڑک کے کہا۔ کون ہے جو آج ایسا ڈراما لکھ سکے؟ یہ سن کے سب کے سر جھک گئے۔ اور ہر طرف سے آوازیں آئیں۔ پیرومرشد بجا و درست۔

آغا سے یہ بات سن کے مجھے ہمیشہ کے لیے کان ہو گئے۔ اگرچہ میں ان کی طرح اپنی تعریفیں آپ نہیں کرتا لیکن کوئی تعریف کرے تو یہ بھی نہیں کہتا کہ حضرت میں تو بالکل جاہل ہوں۔

آغا ہاتھ کے سخی تھے اور دل کے صاف۔ ان کے ملنے والوں میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ تھیٹر کے ایکٹروں اور ڈوم ڈھاڑیوں سے لے کر بڑے بڑے اہلِ علم تک سب سے ان کی بے تکلفی تھی اور وہ ان سب سے بڑے خلق اور مروت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی آغا محمود کو یہ بات ناگوار تھی کہ آغا چھوٹی امت کے لوگوں سے کیوں بے تکلفی سے ملتے ہیں لیکن اُن کے جن لوگوں سے جس قسم کے تعلقات تھے، انہیں مرتے دم تک نبھائے چلے گئے اور وضع داری میں فرق نہ آنے دیا۔ وہ ہر شخص سے اُس کی لیاقت اور مذاق کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ عالموں میں بیٹھے ہیں تو حدوث وقدم مادہ کے

متعلق گفتگو ہورہی ہے یا احادیث کی حیثیت پر بحث کررہے ہیں۔ اسلام، عیسائیت اور آریہ سماج کے اصولوں پر تقریریں کی جارہی ہیں۔ ایکٹروں میں جا پہنچے تو ضلع جگت شروع ہوگئی۔ پھبتیاں کہی جارہی ہیں۔ قہقہے اڑ رہے ہیں۔

آغا نے اگرچہ لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی اڑائے لیکن وہ تنہا خوری کے عادی نہیں تھے۔ جب روپیہ آتا تھا اس میں سب عزیزوں کے حصے لگائے جاتے تھے۔ قریب کے رشتہ داروں کو تو انہوں نے ہزاروں لاکھوں دے ڈالے۔ والدہ کی ایسی خدمت کی کہ کوئی کیا کرے گا لیکن دور کے رشتہ داروں کو بھی وہ کبھی نہ بھولے۔ ان کے عزیزوں میں کئی بیوہ عورتیں اور یتیم بچے تھے۔ اُن سب کے درماہے مقرر تھے۔ روپیہ آتا تھا تو جس کا جو حصہ مقرر تھا اسے گھر بیٹھے پہنچ جاتا تھا۔ غرض آغا کی ذات کئی بیکسوں کی زندگی کا سہارا بنی ہوئی تھی۔ ان کے اٹھتے ہی یہ سہارا مٹ گیا۔

آغا کے کلام اور ان کے ڈراموں پر تبصرہ کرنا میرا فرض نہیں۔ البتہ اتنا ضرور کہوں گا وہ شعر بہت جلد کہتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کے بعد اگر میں نے کسی کو اس قدر جلد شعر کہتے دیکھا تو وہ آغا تھے۔ ڈراموں کا بھی یہی حال تھا اصل میں انہیں لکھنے سے نفرت سی تھی۔ عمر بھر کبھی کسی کو خط کا جواب نہیں دیا اور جواب دیا بھی تو اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔

کئی موقعوں پر ایسا ہوا کہ میں نے ایک مصرع پڑھا۔ انہوں نے برجستہ دوسرا مصرع کہہ دیا۔ اور چند منٹوں میں غزل ہوگئی۔ ان کی غزلوں میں ایک خاص سرمستی اور جوش ہے جو اردو میں ان کے سوا کسی کے ہاں نظر نہیں آتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا اثر ان کے ڈراموں پر بھی پڑا ہے۔ یعنی جس طرح غزل میں ہر شعر مستقل حیثیت رکھتا ہے اسی طرح ان کے ڈراموں کے مختلف اجزا تو اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ لیکن آپس میں مل کر وہ اپنا حسن کسی حد تک کھو بیٹھے ہیں۔ گویا یوں کہنا چاہیے کہ آغا کے ڈراموں کا حسن اجزا میں ہے کُل میں نہیں۔ اِسی مفہوم کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ مکان کا گارا، چونا، اینٹیں اور لکڑی تو اپنی اپنی جگہ بہت اچھے ہیں لیکن جب ان سے مل کر مکان بنتا ہے تو اس میں بہت سے نقص نظر آتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہنا پڑتا ہے کہ انہوں نے اردو ڈرامے کو بہت اونچے مرتبے پر پہنچا دیا اور اس معاملے میں اُن کا کوئی حریف نہیں تھا۔

وہ خود بھی اکثر کہا کرتے تھے کہ میں لوگوں کے مذاق کو ملحوظ رکھ کر ڈرامے لکھتا ہوں ورنہ اگر میں عوام کے مذاق کی پروا نہ کرکے اپنے اصلی رجحانِ طبیعت کے مطابق کچھ لکھوں تو اور ہی عالم نظر آئے۔ میں نے ایک مرتبہ کہا کہ آغا صاحب آپ اپنی طبیعت کے حقیقی جوش کو ظاہر کیوں نہیں ہونے دیتے اور عوام کے مذاق کا اتنا خیال کیوں رکھتے ہیں؟ یہ سن کر آغا کے ابرو پر بل پڑ گئے۔ اور کہنے لگے کہ اگر میں اپنی طبیعت کے صحیح رجحان کی پیروی کرتا تو جوتیاں چٹخاتا پھرتا۔ وہ تو بڑی خیر گزری کہ میں نے زمانے کی نبض کو پہچان لیا۔ لوگوں کے مذاق کے مطابق ڈرامے لکھتا ہوں۔ اور موٹروں میں اڑا پھرتا ہوں۔

۱۹۲۸ء کے اواخر میں آغا حشر نکاری سے کلکتہ آئے ہوئے تھے کہ ایک دن میں ان سے ملنے گیا پہلے تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر کہنے لگے ارے میاں اس اخبار نویسی میں کیا پڑا ہے؟ اِسے چھوڑو اور میرے ساتھ نکاری چلو۔ ڈراما لکھنے میں جرق نہ کردوں تو میرا ذمہ۔ میں نے اس وقت تو کہہ دیا کہ اچھا آغا صاحب یوں ہی سہی۔ مگر گھر آ کے سوچا تو خیال آیا کہ اب تو آغا صاحب سے نیاز مندانہ تعلق ہے۔ ملازمت کا قصہ ہوگا تو اور بات ہوجائے گی۔ کیا عجب کہ کسی بات پر ان سے بگڑ جائے اور جو صاحب سلامت آج ہے یہ بھی نہ رہے لیکن مشکل یہ تھی کہ آغا سے اقرار کرچکا تھا اب انکار کرنے کی ہمت نہیں پڑتی۔ اتفاقاً اِسی درمیان کچھ ایسے پیچ پڑے کہ میں نے کلکتہ چھوڑ لاہور آنے کا تہیہ کرلیا۔ چلنے سے پہلے ایک دن آغا سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی بولے نکاری چلتے ہو نا؟ میں نے کہا۔ میں تو لاہور جانے کا ارادہ کرچکا ہوں۔ وہ یہ سن کر بہت ناراض ہوئے۔ میرے ساتھ لاہور اور لاہور کے اخباروں اور اخبار نویسوں کو بھی لے ڈالا۔ میں تھوڑی دیر بیٹھا ان کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اٹھ کر چلا آیا۔ دوسرے تیسرے دن معلوم ہوا کہ آغا نکاری چلے گئے۔

کوئی سات سال کے بعد آغا سے لاہور میں ملاقات ہوئی۔ میں حکیم فقیر محمد مرحوم کے ہاں ملنے گیا تو چھ سات آدمیوں میں گھرے بیٹھے تھے لیکن میں نے بالکل انہیں نہیں پہچانا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑے تھے۔ گالوں میں گڑھے، ہڈیاں نکلی ہوئیں، گردن کا گوشت لٹکا ہوا۔ پہلے کچھ دن حکیم صاحب کے ہاں ٹھہرے۔ پھر شہر کے باہر ایک کوٹھی کرایہ پر لی اور وہاں اٹھ گئے۔ میں کبھی کبھی وہاں جاتا تھا۔ اگرچہ اب بھی ان کی طبیعت اور وضع داری کا وہی عالم تھا لیکن جہاں انہیں امراض نے آگھیرا تھا وہاں طبیعت میں وہ اگلی سی جودت بھی نہیں رہی تھی۔

ایک دن میں میکلوڈ روڈ سے گزر رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔ مڑ کر دیکھتا ہوں کہ آغا صاحب ایک دکان کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ یہاں کہاں'' فرمانے لگے۔ ''موٹر خراب ہوگئی ہے۔ اس کی مرمت کرانے یہاں بیٹھا ہوں''۔ پھر بولے ''یہ کیا حرکت ہے۔ تم ہمارے ہاں آتے کیوں نہیں'' میں نے کہا ''آغا صاحب فرصت نہیں ملتی''۔ بولے ''چل چلاؤ لگ رہا ہے۔ ہم مرجائیں گے تو افسوس کرو گے؛ کہ آغا سے اس کی زندگی کے آخری دنوں میں بھی نہ ملے''۔ میں نے کہا ''آغا صاحب کل ضرور حاضر ہوں گا''۔ فرمانے لگے۔ ''آج تو میں امرتسر جارہا ہوں۔ پرسوں واپس آجاؤں گا۔ مجھے فون کرلینا''۔

دوسرے دن فون کیا تو معلوم ہوا کہ آغا صاحب ابھی نہیں آئے۔ تیسرے دن، رات کے وقت کسی نے کہا؛ کہ آغا صاحب سخت بیمار ہیں۔ میں نے سوچا کہ اس وقت تو ان سے ملنا مناسب نہیں۔ صبح چلیں گے۔ صبح میں اٹھ کر کپڑے پہن رہا تھا۔ اتنے میں خبر ملی کہ آغا کا انتقال ہوگیا ہے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ جنازہ شہر میں لایا جائیگا۔ اخباروں میں یہ خبر بھی چھپی کہ نیلے گنبد میں نماز جنازہ ہوگی۔ لیکن پھر خدا

جانے کیا ہوا؛ کہ یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ جنازہ کے ساتھ سوسوا سو آدمی تھے۔ ان میں بھی یا تو ان کی فلم کمپنی کے لوگ تھے؛ یا بعض خاص نیازمند کوئی دس بجے جنازہ اٹھا اور گیارہ ساڑھے گیارہ بجے انہیں میانی صاحب کے قبرستان میں سپرد خاک کر دیا گیا۔

(مردم دیدہ)

مشق

۱۔ درج ذیل سوالات کے مختصر جوابات دیں۔

الف) لوگ اینگ خریدنے کے لیے کیوں آمادہ نہیں ہو رہے تھے؟

ب) مصنف کے زمانے میں لوگ تھیٹر کو کس نظر سے دیکھتے تھے؟

ج) مصنف نے اپنے ذہن میں آغا حشر کا کیا خاکہ تیار کیا تھا؟

د) ڈرامے کے بارے میں ثقہ حضرات کی رائے کس طرح بدل گئی؟

ہ) پہلی ملاقات میں آغا حشر نے مصنف کو کس طرح متاثر کیا؟

و) آغا حشر کاشمیری کس قسم کی کتابیں پڑھتے تھے؟

۲۔ متن کے مطابق درست جواب کا انتخاب کریں۔

الف) آغا حشر کاشمیری کے بزرگ.......... رہنے والے تھے۔

i) دہلی کے
ii) لاہور کے
iii) کلکتہ کے
iv) بارہ مولہ

ب) آغا حشر کاشمیری نے نام پیدا کیا تھا۔

i) ڈراما میں
ii) افسانہ میں
iii) ناول میں
iv) شاعری میں

ج) ''فوجِ زمزم'' اور ''شکریہ یورپ'' آغا حشر کاشمیری کے مشہور۔

i) ڈرامے ہیں
ii) نظمیں ہیں
iii) افسانے ہیں
iv) انشائیے ہیں

د) سبق ''آغا حشر'' صنف ادب کے لحاظ سے ہے۔

i) ڈراما ii) افسانہ

iii) خاکہ iv) آپ بیتی

ہ) آغا حشر کی معلومات پر لوگوں کو ہوتی تھی۔

i) حیرت ii) پریشانی

iii) سنجیدگی iv) حسد

۳۔ سبق کے مطابق درست اور غلط کی نشاندہی کریں۔

الف) آغا حشر کاشمیری کے ہاں ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔

ب) آغا حشر کامیابی کے لیے خود اپنی تعریف ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

ج) آغا حشر کے جاننے والوں میں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔

د) آغا حشر کاشمیری دہلی میں دفن ہیں۔

ہ) آغا حشر شعر بہت جلد کہتے تھے۔

۴۔ بہ حوالہ متن درج ذیل عبارت کی تشریح کریں۔ نیز سیاق وسباق بھی لکھیں۔

''آغا بڑے حاضر جواب اور.................. ان کا کوئی حریف نہیں تھا''۔

۵۔ سبق کے مطابق آغا حشر کاشمیری کا ظاہری خدوخال بیان کریں۔

۶۔ سبق پڑھنے کے بعد آپ نے آغا حشر کاشمیری کی شخصیت کیسے پائی۔

۷۔ سبق آغا حشر کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

۸۔ آغا حشر کے زمانے میں پنجاب میں تھیٹر کی حالت کیسی تھی؟

رموزِ اوقاف

''رموز'' رمز کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں اشارہ یا علامت۔ اور ''اوقاف'' وقف کی جمع ہے۔ جس کے معنی ٹھہرنا یا رُکنا۔

تعریف: وہ اشارے یا علامتیں جو کسی عبارت کے ایک جملے کو دوسرے جملے سے یا کسی جملے کے ایک حصے کو اس کے باقی حصوں سے الگ کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ اصطلاح میں رموزِ اوقاف کہلاتی ہیں۔

علاماتِ وقف

۱۔ ختمہ (۔) یہ علامت ایک مکمل جملے کے خاتمے پر لگائی جاتی ہیں۔ یہاں کچھ ٹھہرنا ہوتا ہے۔

۲۔ سوالیہ (؟) یہ علامت سوالیہ جملوں کے آخر میں لگائی جاتی ہے تا کہ ایک عام جملے اور سوالیہ جملے میں امتیاز پیدا ہو جائے۔

۳۔ سکتہ (،) یہ ایسی علامت ہے جس میں ہلکا سا توقف کر کے آگے جانا ہوتا ہے۔

۴۔ تفصیلہ (:۔) یہ علامت کسی چیز کی تفصیل کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔

۵۔ قوسین ( ) قوسین یا خطوط وحدانی میں عبارت کے ایسے حصے لکھے جاتے ہیں۔ جو جملہ معترضہ کے طور پر آتے ہیں۔

۶۔ واوین (" ") یہ علامت کسی دوسرے کی تحریر کا اقتباس یا کسی کا قول پیش کرتے وقت اس کے شروع اور آخر میں لگائی جاتی ہے۔

۷۔ ندائیہ (!) یہ علامت تب استعمال کی جاتی ہے جب کسی کو متوجہ کرنا مقصود ہو۔

۸۔ وقفہ (؛) یہ علامت سکتے سے زیادہ دیر ٹھہرنے کے لیے ہوتی ہے۔

سرگرمیاں

۱۔ اساتذہ کرام طلبہ سے کسی بھی علمی، ادبی یا صحافتی موضوع پر ان کے مطالعے، تجربے اور مشاہدے کی روشنی، استدلال، دُرست تلفظ اور عمدہ لب ولہجہ کے ساتھ پانچ منٹ تک زبانی تقریر کروائیں۔

۲۔ طلبہ سے کسی بھی تخلیقی سطح کی تحریر (ڈائری، رپورٹ، انشائیہ، کہانی، افسانہ، غزل، نظم وغیرہ) کو مناسب تربیت/اصلاح کے بعد پیش کروائیں۔

۳۔ طلبہ کو آغا حشر کاشمیری کے کسی ڈرامے کے مکالمے سنوائیں۔

۴۔ چراغ حسن حسرت کا کوئی اور خاکہ کمرہ جماعت میں سنائیں۔

اشاراتِ سبق

۱۔ طلبہ کو شخصیت نگاری/خاکہ نگاری کے طریقے سے آگاہ کریں۔

۲۔ اُردو نگاری میں آغا حشر کاشمیری کے مقام سے واقفیت دلائیں۔

۳۔ اُردو ادب میں چراغ حسرت کے مقام پر لیکچر دیں۔

۴۔ چراغ حسن حسرت کے اُسلوبِ نثر کے فنی محاسن بتائیں۔